ناول ”شہر خالی، کوچہ خالی“ کا تنقیدی مطالعہ

A Critical Study of the Novel “Shahr khali, Kucha Khali”

DOI: https://doi.org/10.54692/nooretahqeeq.2024.08032245

ڈاکٹر انتل ضیاء
Dr Antail Zia
Assistant Professor, Department of Urdu
Shaheed Benazir Bhutto Women University, Peshawar

فائقہ بی بی
Faiqa Bibi
MPhil Scholar, Department of Urdu
Shaheed Benazir Bhutto Women University, Peshawar

Abstract:

"Shahr Khali Kocha Khali" is a renowned novel written by Mustansar Hussain Tarar, a prominent Pakistani writer and travelogue author. The novel was first published in 1979 and has since become a classic of Pakistani literature. Tarar's writing evokes a sense of nostalgia for a bygone era while also addressing contemporary issues. "Shahr Khali Kocha Khali" is not just a novel but a commentary on urbanization, societal changes, and the complexities of human relationships. It captures the essence of Lahore's history and culture, making it a significant work in Pakistani literature.

Keywords:

Discontinuity, Echo, Monstrosity, Entanglement, Eensory Perception, Perception, Cognition, Hypnotized, Continuous effort, Imperceptible.

عام لوگوں کے مقابلے میں ادیب حساس طبعیت کے مالک ہوتے ہیں کوئی بھی رونما ہونے والا واقعہ عام لوگوں کو اس قدر متاثر نہیں کرتا جتنا اس کا اثر ادیب قبول کرتے ہیں۔ کورونا وبا کے دوران میں عام لوگوں کے ساتھ ساتھ ادیب اور شاعر بھی ذہنی اذیت سے دوچار ہوئے انھیں بھی تنہائی کا عذاب جھیلنا پڑا۔ جبری تنہائی میں بیتے شب و روز کی کہانی ہر ادیب اور شاعر نے اپنے اپنے انداز میں بیان کی۔ کسی نے افسانہ قلم بند کیا تو کسی نے ناول لکھ لیا، کسی نے نظم لکھی اور کسی

نے محسوسات کو غزل کا جامہ پہنایا۔ مایہ ناز ادیب مستنصر حسین تارڑ نے ناول "شہر خالی، کوچہ خالی" میں کورونا کے دوران گزرے شب و روز کی کہانی لکھی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے دنیا بھر میں پھیلنے والی مہلک وبا کورونا کے تناظر میں ناول "شہر خالی، کوچہ خالی" کے نام سے تحریر کیا۔ یہ ناول ۲۰۲۰ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ "امیر جان صبوری" جو افغان شاعر اور موسیقار ہیں کا لکھا گیا کلام "شہر خالی، جادہ خالی، کوچہ خالی، خانہ خالی" جو تاجک گلوکارہ "نگارہ خلاوہ" نے گایا ہے۔ اسی کلام سے ناول نگار نے ناول کا عنوان مستعار لیا ہے۔ ناول کا عنوان پڑھتے ہی قاری کے ذہن کے پردے پر وبا کے سبب سنسان رستوں، خالی بام و در، ویران گلی، کوچوں اور اجڑے شہروں کا عکس نمودار ہو جاتا ہے۔ شہروں کا اجڑنا اور گلی، کوچوں کا خالی ہونا کوئی عام بات نہیں۔ شہر تب ہی ویران ہوتے ہیں جب کوئی الم ناک واقعہ رونما ہوتا ہے یا کوئی حادثہ پیش آتا ہے جیسا کہ مغلیہ سلطنت کے زوال پذیر ہوتے ہی دہلی کی رونقیں ماند پڑ گئیں۔ اندرونی سازشوں اور بیرونی حملہ آوروں کے پے در پے حملوں نے شہر کو اُجاڑ دیا۔ قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا تو عام لوگوں کے ساتھ ساتھ معززینِ شہر نے بھی محفوظ مقامات کی طرف ہجرت کی۔ دہلی میں علم و ادب کی جو محفلیں سجتی تھیں وہ ختم ہو گئیں۔ دہلی کے اجاڑ پن کا ذکر کئی ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات میں کیا جیسا کہ ناصر کاظمی لکھتے ہیں:

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دِلّی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ
سارا سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں بے کار
راتوں اٹھ اٹھ کر روتے ہیں اس نگری کے لوگ (۱)

شہروں کے اجڑنے کا سبب جنگ اور قتل و غارت گری ہی نہیں ہوا کرتی بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کوئی وبا پھیلتی ہے تو آباد بستیاں ویران کھنڈروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ کورونا وبا کے دوران میں بھی سماجی دوری اختیار کر کے جب کاروبارِ حیات کو معطل کر دیا گیا تو گلی کوچے خالی اور شہر سنسان ہو گئے تھے۔

مستنصر حسین تارڑ نے ناول "شہر خالی، کوچہ خالی" میں وبا کی وجہ سے سنسان گلی، کوچوں کی منظر کشی کی ہے۔ مصنف نے ناول میں فلیش بیک تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ فلیش بیک سے مراد حال کو ماضی سے جوڑنا۔ جب کہانی کا کوئی کردار حال میں سوچتے ہوئے ماضی میں چلا جائے تو اسے فلیش بیک تکنیک کہتے ہیں۔ ناول نگار نے ناول میں کئی ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے جس کا سرا ماضی سے ملتا ہے۔ کورونا وبا کی وجہ سے بستیوں میں اجاڑ پن دیکھ کر مصنف کو بچپن میں دیکھی فلم یاد آتی ہے۔

"یہ بھی بچپن کے قصے ہیں، جب ایچ جی ویلز کے ناول "وار آف دے ورلڈ" پر مبنی ایک

فلم دیکھی تھی۔ کوئی خلائی مخلوق زمین پر نازل ہو کر تباہی مچا دیتی ہے، تاج محل ڈھے رہا ہے، اہرامِ مصر مسمار ہو رہے ہیں، معبد کھنڈر ہو رہے ہیں، شہر تباہ ہو رہے ہیں وغیرہ۔ تباہی و بربادی کی چڑیلیں تب تو صرف پردہ سکرین پر شائبوں کی صورت میں دکھائی دیتی تھیں لیکن ان دنوں تو وہ کورونا کا روپ دھار کر ہماری آنکھوں کے سامنے کرۂ ارض کو تباہ کرنے پر تُل گئی ہیں۔۔ یہ دنیا ویران ہو گئی ہے۔"(۲)

مستنصر حسین تارڑ کا کورونا وبا کے پس منظر میں تخلیق کردہ ناول "شہر خالی، کوچہ خالی" ادبی سرمایہ میں قیمتی اضافہ ہے۔ اس ناول کو اگر ناول نگار کے کورونا وبا کے دوران میں گزرنے والے شب و روز کی آپ بیتی کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کیوں کہ کورونا کے دوران جو کچھ مصنف پر بیتا اور جو چیزیں اُن کے مشاہدے میں آئیں، اسے بغیر کسی لگی لپٹی کے صفحۂ قرطاس پر اُتار دیا۔ مستنصر حسین تارڑ کی شخصیت سے ناواقف قارئین کے لیے یہ ایک ناول ہی ہے۔ لیکن جو مستنصر حسین تارڑ کی شخصیت سے تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتے ہیں تو ناول کا مطالعہ کرتے وقت انھیں احساس ہو گا کہ یہ صرف ناول ہی نہیں بلکہ مصنف کے ذاتی تجربات و مشاہدت کا عکس ہے۔ ناول میں بیان کردہ کئی واقعات ایسے ہیں جو حقیقت پر مبنی ہے۔ مصنف کے ذاتی تجربات و مشاہدات کا بیان صرف ناول "شہر خالی، کوچہ خالی" تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ان کے دیگر تخلیقات میں بھی ان کی ذاتی زندگی کی جھلکیاں کسی نہ کسی صورت میں ملتی ہیں۔ ناول میں ذاتی زندگی کا عکس پیش کرنے کے بارے میں مستنصر حسین تارڑ سہ ماہی ادبی جریدہ "اجرا" کو دیے گئے انٹرویو میں کہتے ہیں:

"ہر ایک کا اپنا اپنا پیٹرن ہوتا ہے۔ مجھے اپنی آوارہ گردی کا Edge حاصل ہے۔ میں اُسے استعمال کرتا ہوں۔ اس طرح میری شخصیت میری تحریر میں آجاتی ہے۔ پھر جتنے بڑے ناول ہیں وہ سب Semi. Autobiographies ہیں۔ ہیمنگ وے کے تمام ناول ہی Semi. Autobiographies ہیں۔ میرے ناولوں میں یہ بات پکڑی جاتی ہے، کیوں کہ لوگ میری ذاتی زندگی کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں، لیکن جو نہیں جانتے ان کے لیے وہ خالص فکشن ہے۔"(۳)

انسان ماضی سے کٹ کر نہیں جی سکتا کیوں کہ اس کی جڑیں ماضی میں پیوست ہوتی ہیں۔ گزرے وقت کی یادوں کو قیمتی اثاثہ تصور کیا جاتا ہے۔ خوش گوار لمحوں کی یادیں انسان کو جہاں مسرت و انبساط سے سرشار کرتی ہیں تو وہاں تلخ اور غمگین یادیں انسان کو افسردہ کر دیتی ہیں۔ ابتدا سے یادِ ماضی کا حوالہ ادبی تخلیقات کا محور رہا ہے۔ خصوصاً قیامِ پاکستان کے بعد جتنا بھی ادب تخلیق ہوا اس میں ناسٹلجیائی رجحان بنیادی عنصر کے طور پر موجود ہے۔ ناسٹلجیا کو گھر جانے کی شدید خواہش سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لیے ہجرت کا کرب اور زمین سے دوری کا احساس ۱۹۴۷ء کے بعد منظرِ عام پر آنے والی

تخلیقات کا بنیادی حوالہ ہے۔ زمین سے دوری کا احساس ہی ناسٹلجیائی رجحان کے طور پر سامنے نہیں آتا بلکہ آبادی کی جبری منتقلی، تہذیبوں کی شکست وریخت، رشتوں کا انقطاع، غیر یقینی صورت حال، بے جڑ ہونے کا احساس، لمحۂ موجود کی ناآسودگی وغیرہ ناسٹلجیائی کیفیت کا سبب بنتے ہیں۔ ماضی کی بازگشت، نامکمل آرزوؤں اور تکلیف دہ یادوں کا احساس ہی نہیں بلکہ خوش گوار یادوں کا استعارہ بھی ہے۔

> "ناسٹلجیا کا لفظ یونانی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کا مطلب ہے "گھر واپس جانے کی درد ناک خواہش"۔۔۔ اسے ہم ماضی کے شدید احساس سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ذاتی تجربہ ضروری ہے۔ ناسٹلجیا کے شکار ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ذاتی تجربے کو قصے کے لیے کام میں لائے ورنہ بصورتِ دیگر یہ محض ماضی کا ایسا احساس ہو گا جو درسی کتب یا عام تاریخی لٹریچر کے مطالعے سے بیدار ہو گا۔"(۶)

پرانے وقتوں میں آبادی کم، وسیع و عریض سرسبز میدان اور گھنے جنگلات زیادہ تھے۔ چرند پرند آزادنہ نقل وحرکت کرتے تھے۔ انسان کو بہتر سے بہتر کی تلاش تھی مگر مادہ پرستی سے ناآشنا تھا۔ اس لیے کرۂ ارض فطری حسن سے مالا مال تھا۔ انسان نے ترقی کی منزلیں طے کرنا شروع کیں، آبادیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ مادی اسباب اور سہولیات حاصل کرنے کی غرض سے فطرت کا چہرہ مسخ کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ وہ علاقے جو جنگلات اور سرسبز میدانوں پر مشتمل تھے وہاں پر بلند و بالا عمارتیں کھڑی کر دیں۔ جنگلی جانوروں کو جبراً اس کی زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا۔ انسان کو ترقی اور اسباب تو ملے لیکن اس کی زندگی سے سکون عنقا ہو گیا۔ شہر پھیلے لیکن روایات کی پاس داری ختم ہو گئی۔ پروان چڑھنے والی نسلیں سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی ورثے سے دور ہوتی گئیں۔ بے یقینی، لاتعلقی اور بے جڑ ہونے کا احساس ہر شے پر غالب آنے لگا۔ اس صورت میں عمر کی کئی منزلیں طے کرنے کے بعد بھی گزرے لمحات کی بازگشت سے انسان کے لیے چھٹکارہ حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ تنہائی کے لمحے میسر ہوتے ہی یادوں کے دریچے کھل جاتے ہیں کیوں کہ ماضی کے تلخ و شیریں واقعات تنہائی میں ہی یاد آتے ہیں۔ کورونا وبا کی عفریت نے انسانوں کو تنہا رہنے پر مجبور کیا۔ تنہائی کے کرب میں مبتلا لوگوں کے پاس ماضی کو یاد کرنے کے سوا کوئی دوسرا چارہ ہی نہیں تھا۔ ناول "شہر خالی، کوچہ خالی" میں مصنف نے ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے اپنے والد محترم سے سنا قصہ قلم بند کیا ہے:

> "ذرا آج سے ستر برس پیچھے سفر کر جاؤ، گردشِ ایام پیچھے کی طرف لوٹا دو جب تم بچے تھے، باپ کی گود میں بیٹھ کر کہانیاں سنا کرتے تھے۔۔ اور وہ دن یاد کرو جب تم نئے گھر میں، اندرون شہر کے ایک تاریک گھر میں سے نہر کے پار ایک جدید بستی کے گھر میں منتقل ہوئے تھے تو ایک شب تمہارے باپ نے کہا تھا کہ میں یہاں مجرم محسوس کرتا ہوں اور

اُس نے ایک کہانی سنائی تھی۔ یہ آج سے تقریباً چالیس برس پیشتر کا قصہ ہے۔۔۔ اور جانتے ہوں کہ وہ علاقہ کونسا تھا۔۔ یہی جہاں اب ایک وسیع بستی آباد ہو چکی ہے اور جہاں ہمارا یہ نیا گھر ہے۔ یہاں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر جنگلی ہرنوں کی ایک ڈار ٹرین کے ساتھ بھاگتی جارہی تھی۔۔۔ اُن کا خیال تھا کہ ہم تیز دوڑ کر اس ہولناک شے سے آگے نکل جائیں گے۔۔۔ یہاں جہاں آج ہمارا نیا گھر ہے، یہاں ویرانے ہوا کرتے تھے اور ہرنوں کی ڈاریں ہوا کرتی تھیں۔ میں اسی لیے آج مجرم محسوس کرتا ہوں کہ ہم اُن کی چراگاہوں پر قابض ہو گئے ہیں۔"(۵)

یوں تو ناول "شہر خالی، کوچہ خالی" حال کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ ناول کا موضوع حال ہی میں رونما ہونے والی مہلک وبا کورونا ہے۔ لیکن حال میں جہاں مستقبل کے اندیشے شامل ہوتے ہیں وہاں اس کے تانے بانے ماضی سے بھی ملتے ہیں۔ حال میں ماضی کی کھٹی، میٹھی یادیں اور مستقبل کی اُمید نہ ہو تو حال بے معنی و مصرف ہو جاتا ہے۔ حال میں رونما ہونے والا کوئی بھی واقعہ ہو اس کا کوئی نہ کوئی سِرّا کسی نہ کسی صورت میں ماضی سے ملا ہوا نظر آتا ہے۔ کورونا وبا اکیسویں صدی میں وقوع پذیر ہوئی ہے لیکن جب ہم کلاسیکی ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ماضی میں بھی اسی قسم کی وبائیں ظہور پذیر ہو چکی ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف کثیر تعداد میں اموات ہوئیں بلکہ لوگوں کو انجانے خوف کے ساتھ ساتھ تنہائی کا عذاب بھی جھیلنا پڑا۔ مستنصر حسین تارڑ جب ارد گرد کے حالات کو دیکھتا ہے تو اُسے لگتا ہے کہ "البرٹ کامیو" نے ناول "دے پلیگ" اس کے کہیں آس پاس بیٹھ کر لکھا تھا۔

"تو اگر یہ وبا ممکن ہو گئی ہے تو یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ البرٹ کامیو میرے برابر کے گھر میں رہتا تھا اور میں اُس کی موجودگی سے بے خبر رہا تھا۔۔ یہ امکان قوی تر ہو گیا جب میں نے "دے پلیگ" کا کچھ حصہ پڑھا کہ یہی تو انھی وقتوں کہ قصّے تھے، یہی اس شہر کے اُجاڑ پن کو بیان کیا گیا ہے۔۔ لوگوں کی وہی بے یقینی کہ ہمیں کچھ نہیں ہو گا، انکار کی وہی کیفیت، اقرار سے کوسوں دور، یہی مردنی جو شہر میں اٹھتے جنازوں کی نسبت بڑھتی جاتی ہے تو میں خوب آگاہ تھا۔۔ کامیو نے یہیں آس پاس بیٹھ کر یہ ناول لکھا تھا تو میں نے اسے ادھورا چھوڑ دیا۔۔"(۶)

انسان اپنی مرضی سے تنہا رہنے کا انتخاب کر بھی لے تو وہ زیادہ دیر تنہا نہیں رہ سکتا کیوں کہ انسان سماجی حیوان ہے۔ زندگی میں کئی مرحلے ایسے آتے ہیں کہ اسے دوسرے پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ تن تنہا وہ کچھ نہیں کر سکتا سماج کے قیام کا انحصار بھی انسانوں کے میل جول پر ہے لیکن کورونا وبا کے پھیلنے کے بعد انسان کا سماجی حیوان ہونے کا نظریہ بھی غلط

ثابت ہو رہا تھا کیوں کہ کورونا کے دوران سماجی دوری اختیار کرنے پر زور دیا گیا۔ لوگ تنہا رہنے پر مجبور تھے۔ جبری تنہائی کے دوران لوگ مختلف شکوک و شبہات میں مبتلا رہے۔ کئی قسم کے خدشات تھے جو سر اٹھا رہے تھے۔ جس کا اظہار مستنصر حسین تارڑ نے ناول "شہر خالی، کوچہ خالی" میں کیا ہے۔ مصنف اس وہم میں مبتلا رہا کہ اگر تنہائی کا دورانیہ طویل ہو گیا تو لوگ تنہا رہنے کے عادی ہو جائیں گے لوگوں سے میل ملاپ سے کترائیں گے کیوں کہ خود مصنف بھی تنہائی پسند ہو کر لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کو ترجیح دینے لگا تھا اور تنہائی کی کیفیت سے لطف لینے لگا تھا۔ قیدِ تنہائی ختم ہونے کے بعد بھی نظروں سے اوجھل رہنے کا فیصلہ کیا۔ مصنف نے تنہائی کے صرف منفی پہلوؤں کو بیان نہیں کیا ہے بلکہ وبا اور تنہائی کے مثبت پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وبا اور تنہائی کی وجہ سے جو خاموشی چلی آئی وہ مصنف کے لیے سود مند ثابت ہوئی:

> "کیوں کہ وہ سب جہاز ائیر پورٹ پر بے جان پڑے ہیں، حنوط ہو چکے ہیں۔۔ اگر شہر خالی ہو گیا ہے، کرۂ ارض خالی ہو گیا ہے تو آسمان بھی ان مہیب آوازوں سے خالی ہو گیا ہے۔۔ تو میں نے بھی بہتر سننا شروع کر دیا ہے۔۔ مجھے تو اس وبا سے افاقہ ہوا ہے۔"(۷)

کورونا وبا میں لاک ڈاؤن کے دوران میں لوگوں کو فرصت کے لمحات میسر تھے۔ فرصت کے ان لمحات کو تمام لوگوں نے اپنی اپنی افتادِ طبع سے مصرف میں لانے اور کار آمد بنانے کی کوشش کیں۔ وبا کی تنہائی میں مصنف کی تفریح اور دلچسپی کا مرکز مصنف کے گھر کی چار دیواری کی منڈیر تھی۔ کیوں کہ وہاں ہر روز مختلف رنگ و نسل کے خوش نظر پرندے اُترتے تھے۔ وہ تمام خوش نظر پرندے جنھوں نے بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے شہر کی حدوں سے دور جنگلات میں بسیرا کر لیا تھا۔ وبا کے باعث جب انسانوں کے میل جول اور بلا ضرورت گھر سے نکلنے پر پابندی لگی تو شہر ویرانوں کا منظر پیش کرنے لگے۔ وہ پرندے اور حیوان جنھوں نے انسانوں کے ہجوم سے گھبرا کر آبادیوں سے دور ویرانوں اور جنگلوں میں پناہ لی تھیں۔ وبا کے دوران میں لوگوں کی نقل و حرکت محدود ہونے کا فائدہ اٹھا کر پھر سے شہر کا رخ کیا۔ بقول ناول نگار:

> "آج اتنے زمانوں کے بعد پہلی بار اس منڈیر پر مختلف نسلوں کے پرندے بے دھڑک اتر چکے تھے، ٹہل رہے تھے، اٹھک بیٹھک کرتے پھڑ پھڑاتے رہے تھے اور چونچیں کھولے ایک بے خودی کے عالم میں غل کرتے شائد مجھے ہی متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔۔۔ پرندے واپس آ گئے تھے۔ انسانی آبادیوں نے انھیں جیسے ہجرت کر جانے پر مجبور کر دیا تھا، اب انسان دبک کر اپنے قید خانوں میں مقفل ہو چکا تھا اور یہ مہاجر اپنے آبائی وطن لوٹ آئے تھے۔"(۸)

ناول "شہر خالی، کوچ ہ خالی" میں پرندوں کا ذکر ناول میں تخیّل کا رنگ بھرنے اور ناول میں فینٹسی پیدا کرنے تک محدود نہیں ہے بلکہ پرندوں کو ناول میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اکثر ادیبوں کے ہاں پرندوں کا کردار منظر کشی کی

حد تک ہوتا ہے۔ شاعر و ادیب منظر کو جاذبِ نظر اور جان دار بنانے کے لیے پرندوں کی خوب صورتی اور چہکار کا سہارا لیتے ہیں۔ کوئی مور کے کردار کو اس کی ناچ تک محدود رکھتا ہے تو کوئی کوئل کی سریلی آواز کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن مستنصر حسین تارڑ کے ہاں معاملہ اس کے برعکس ہے وہ پرندوں کا ذکر منظر کشی کی حد تک محدود نہیں کرتے۔ بلکہ اسے کردار دے کر پیش کرتے ہیں۔ ناول میں فاختہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جو کہ بیک وقت زندگی اور امید کا استعارہ بن کر مصنف کے منڈیر پر اترتی ہے۔ وبا کے ختم ہونے کی نوید سناتی ہے۔ ہمت نہ ہارنے، ثابت قدم رہنے کا سبق اور فرض شناس ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ فاختہ کو کشتی والا زمین پر خشکی کا ٹکڑا تلاش کرنے کے لیے بھیجتا ہے۔ فاختہ نسلِ انسانی کی بقا، اس کے تسلسل اور وبا کے سمٹ جانے کی خوش خبری لے کر ہی اترتی ہے۔ فاختہ حیاتِ انسانی کی نوید سناتی ہے تو چیل وبائی مرض اور موت کی علامت بن کر نحوست پھیلانے کا سبب بنتی ہے۔

ناول میں پرندوں کا تذکرہ کرنے اور اسے اہمیت دینے کی وجہ وبا کی بدولت ملی ہوئی تنہائی میں اکیلے پن کو دور کرنا اور اکتاہٹ کو ختم کرنا ہے۔ لاک ڈاؤن کے دوران مصنف جتنا عرصہ گھر اور کمرے تک محدود رہا۔ اس دوران گھر کی چار دیواری کی منڈیر پر جتنے پرندے نمودار ہوئے نہ صرف مصنف کی دلچسپی و توجہ کا مرکز رہے۔ بلکہ اس دوران پرندوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں بھی کامیاب رہے۔ جس روز منڈیر پر کوئی پرندہ نہیں اترتا۔ مصنف کا وہ دن اچھا نہیں گزرتا، کیوں کہ منڈیر وبا کے دنوں میں تھیٹر کی سٹیج کے برابر کا درجہ رکھتا ہے۔ ایسا سٹیج جس پر مصنف پرندوں کو ڈرامائی کرداروں کے روپ میں ڈال اپنی پسند کا ڈراما متشکل کر کے دیکھتا ہے۔

> "یہ جو لالیاں یا مینائیں ہیں، ہمہ وقت چونچیں چلاتی، سوتنوں کی مانند آپس میں لڑتی مرتی رہتی ہیں، یہ بخوبی میکبتھ کی تین چڑیلیں ہو سکتی ہیں ۔۔۔ ایک بہت کائیاں کوے کو شائیلاک کے کردار کے لیے بچا رکھا ہے۔ اب آپ معاون ثابت ہو سکتے ہیں کہ ہیملٹ کا پیچیدہ کردار کس پرندے کے سپرد کیا جائے کہ وبا کہ ان موسموں میں وہ ایک کھوپڑی سے مخاطب ہو کر جب یہ مکالمہ ادا کرے گا کہ۔۔۔ ٹوبی آر ناٹ ٹوبی ۔۔۔ تو یقین کیجئے خوف سے لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے، کھوپڑی پر جلی حروف میں "کورونا" لکھا ہو گا۔۔۔ اور ہاں رومیو اینڈ جولیٹ کے کردار کے لیے مجھے چنداں دشواری نہ ہو گی، یہ جو آپس میں چہلیں کرتی بلبلیں ہیں آخر یہ کس کام آئیں گی۔۔۔ کبوتر اگر وہ آجائیں تو میں فوری طور پر "سنو لیک" کا بیلے آپر اترتیب دوں گا اور سب سے نخریلی کبوتری کو مرکزی بیلے رینا بناؤں گا کہ کبوتروں کی چال میں بیلے رقص ایسے نپے تلے اور نازک قدم ہوتے ہیں۔ گھریلو چڑیوں کو تماشائیوں کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے، وہ غُل کرنے کا فریضہ

بخوبی سر انجام دے سکتی ہیں۔"(۹)

مستنصر حسین تارڑ کا پرندوں میں دلچسپی لینے کی وجہ صوفی شاعر فرید الدین عطار کی شخصیت اور خاص طور پر فارسی زبان میں اس کی تحریر کردہ مثنوی "منطق الطیر" ہے۔ فرید الدین عطار نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام "ابو حمید ابن ابو بکر ابراہیم" تھا۔ شیخ فرید الدین عطار آپ کا قلمی نام ہے۔ آپ ماہر ادویات تھے اس لیے عطار آپ کے نام کا حصہ ٹھہرا۔ آپ نے "منطق الطیر" کے نام سے فارسی زبان میں مثنوی تحریر کی جو چار ہزار چھے سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں سات وادیوں کے سفر (طلب و جستجو، عشق، معرفت، استغنا، توحید، حیرت اور فنا) کا بیان لکھا ہے۔ ہدہد کی رہنمائی میں تیس پرندے ان سات وادیوں کا سفر کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ، شیخ فرید الدین عطار کی تحریر کردہ مثنوی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ نہ صرف ان کی ہر تحریر میں پرندوں کا تذکرہ ملتا ہے بلکہ "منطق الطیر جدید" کے نام سے پورا ناول تخلیق کیا۔ اس ناول کا انگریزی میں "Conference of Birds" کے نام سے ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ فرماتے ہیں کہ:

> "منطق الطیر معروف صوفی شاعر فرید الدین عطار کی کتاب ہے۔ یہ تصوف کی ایک بہت بڑی کتاب ہے۔ میں پچھلے پچاس سال سے اس کے سحر میں مبتلا ہوں، جب بھی کچھ لکھتا ہوں تو اُس میں کہیں، اس کتاب کے پرندے آجاتے ہیں۔ تو اصل بات یہ ہے کہ میرا ناول "منطق الطیر جدید" ایک خراجِ عقیدت ہے جو میں اپنے مرشد فرید الدین عطار کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے وہ لکھا اور میں نے یہ لکھا ہے۔"(۱۰)

جو ادب کسی خاص مذہب، مسلک، نظریہ، خطہ، قبیلہ یا قوم کا پرچار کرنے کی بجائے تمام انسانیت کو بغیر کسی امتیاز کے اپنا موضوع بناتا ہے وہ آفاقی ادب کہلاتا ہے۔ جغرافیائی سرحدوں سے ماورا، حدود و قیود سے آزاد عالمگیر سطح کا حامل ادب کبھی نہیں مرتا بلکہ ہر دور میں زندہ رہتا ہے۔ حیات و موت ایسے موضوعات ہیں جنھیں آفاقیت کا درجہ حاصل ہے۔ موت و حیات کا تصور ہر مذہب، عقیدے، مسلک اور قوم میں کسی نہ کسی حوالے سے موجود ہے۔ زندگی حرکت و عمل کا دوسرا نام ہے۔ حیات کی رنگینی اور دلکشی حرکت و عمل کے جذبے میں ہی پنہاں ہے۔ حرکت و عمل یعنی کچھ کر گزرنے کا جذبہ انسان کو جہدِ مسلسل پر آمادہ رکھتا ہے۔ زندگی سے تحرک کا عمل اگر مفقود ہو جائے تو زندگی جمود و تعطل کا شکار ہو جاتی ہے۔ انسان یکسانیت کا شکار ہو کر اُکتا جاتا ہے۔ زندگی میں ٹھہراؤ موت کی علامت ہے۔ زندگی سے محبت اور موت سے خوف کا جذبہ انسان کی جبلت میں شامل ہے۔ جبلت سے مراد وہ عادات و خصائل جو پیدائشی ہوتے ہیں جو انسان کی سرشت میں شامل ہوں جب کہ جبلتِ حیات سے مراد وہ قوتیں، اعمال اور افعال جو زندگی بخش ہوں جو زندگی جینے پر آمادہ کرے۔ اس کے برعکس ایک جبلت جبلتِ مرگ ہے یعنی مرنے اور مارنے کی خواہش۔ جو کہ ایک نفسیاتی عارضہ ہے۔ ڈاکٹر نعیم احمد فرائڈ

کے نظریۂ جبلتِ حیات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک جبلت اس کے نزدیک حیات ہے۔ اس کے تحت وہ ان تمام جبلتوں کی تنظیم کر دیتا ہے جو حیات آفریں اور زندگی بخش ہوں۔۔۔ تحفظ ذات اور اشاعت ذات کی جبلتیں دراصل زندگی کے عمل کو آگے بڑھانے سے متعلق ہیں۔ اس لیے انھیں "جبلت حیات" میں مدغم کر دیا گیا۔ اس کے برعکس ایک جبلت مرگ ہے جو عضویہ کو غیر نامیاتی مادے کی طرف دھکیلنے کا محرک ہے۔"(۱۱)

انسان میں جبلتِ حیات کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اس لیے تو وہ ابتدا ہی سے موت سے برسرِ پیکار ہو کر زندگی جینے کے جتن کرتا چلا آرہا ہے۔ زندگی اور موت لازم و ملزوم ہیں۔ زندگی کے ساتھ ہی فنا کا تصور جڑا ہے اور فنا کا احساس جس دل میں جاگزیں ہو جائے وہ زماں و مکاں کی قید سے آزاد ہو کر ہر ڈر ہر خوف سے ماورا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی توانائی دنیا کی فانی زندگی جینے کی بجائے غیر فانی زندگی جینے کی تیاری میں صرف کرتا ہے۔ موت ایک جانب لوگوں کے لیے فنا کا تصور ہے تو دوسری جانب کچھ لوگوں کے لیے بقا کا نام ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر ہو جانے کا احساس ہے۔ ایسے لوگوں کے نزدیک زندگی کی اصل شروعات مرنے کے بعد ہوتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے نزدیک زندگی کا حسن فنا کے احساس کے ساتھ مشروط ہے۔ دنیا کی زندگی قلیل المدت اور ختم ہو جانے والی ہے یہی احساس انسان کو متحرک رکھتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ناول "شہر خالی، کوچہ خالی" میں تصور حیات و موت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شاہ حسین کے لیے تو موت دائمی بہار کی ایک کونپل تھی جسے وہ آس، امید اور وصل کے پانیوں سے سینچتا رہتا تھا تاکہ یہ ایک شجر ہو جائے اور وہ فنا کے سائے تلے پناہ لے کر اپنے اس خواب کی تکمیل کر سکے۔۔ وہ مادھو کو تلقین کرتا تھا کہ۔۔ اگر تم حیاتی کی تلاش میں ہو تو اپنی موت سے پہلے مر جاؤ۔"(۱۲)

ناول "شہر خالی، کوچہ خالی" میں مصنف کے نزدیک زندگی ہر لمحہ، ہر پل نئے معانی و مفاہیم کے در وا کرتی نظر آتی ہے۔ کبھی یہ یاس و نا اُمیدی کا لبادہ اوڑھے غیر یقینی صورت حال سے برسرِ پیکار ان سوالات کے جوابات کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتی ہے کہ وبا کب ختم ہو گی؟ جبر اًمسلط کی گئی قیدِ تنہائی سے چھٹکارا کب ملے گا؟ وبا سے بچ پائیں گے یا وبا کا شکار ہو کر موت کی تاریک وادیوں میں اتر جائیں گے؟ تو کبھی زندگی بے بسی اور لاچاری کی تصویر بن کر داتا دربار میں موجود کورونا کے باعث روزگار چھن جانے والے مفلوک الحال دیہاڑی دار لوگوں کی صورت میں نظر آتی ہے تو کبھی داتا دربار میں موجود فاتر العقل مجذوب کی صورت میں "مولا ای مولا" کی صدا لگاتی اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے اور کبھی مٹ جانے کے احساس سے مغلوب ہو کر ڈر و خوف کا استعارہ بن جاتی ہے۔

جب موت وبائی مرض کورونا کاروپ دھار کر چن چن کر لوگوں کا شکار کر رہی تھی۔ ہر طرف خوف اور سراسیمگی کی فضا طاری تھی۔ لوگ بے یقینی کا شکار تھے۔ خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ انسان اپنے آپ سے بھی خوف زدہ تھا۔ لوگ اس قدر محتاط ہو گئے تھے کہ سانس لیتے بھی ڈرتے تھے۔ کورونا کے باعث کثیر تعداد میں ہونے والی اموات سے ایک طرف خوف و ہراس کی فضا پھیلی تھی تو دوسری طرف مرنے والوں کی تجہیز و تکفین کا مرحلہ بھی دشوار ہو گیا تھا۔ گویا مرنے کے آداب طے کیے گئے تھے۔ جگہ کم پڑ جانے کی وجہ سے میتوں کو اجتماعی قبروں میں دفنایا جانے لگے عزیز و اقارب کو قریب جانے کی اجازت نہیں تھی۔ گورکن چہرے کو ماسک سے ڈھانپ کر دستانے پہن کر سینی ٹائزر کا چھڑکاؤ کر کے میت کو سپردِ خاک کر دیتا۔ اُردو غزل کے بے تاج بادشاہ مرزا اسد اللہ غالبؔ جس نے وبائے عام میں مرنا گوارا نہیں کیا تھا کی طرح مستنصر حسین تارڑ نے بھی وبا کے دنوں میں مرنا مناسب نہیں سمجھا:

> "ایسا نھیں کہ میں اپنی موت سے خوف زدہ ہوں۔۔ صرف یہ ہے کہ میں وبا کے ان دنوں میں مرنا نہیں چاہتا۔۔ وبا کا شکار ہو کر اپنی اولاد کو امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ انسان دنیا کی ہر حقیقت کو تسلیم کر لیتا ہے لیکن موت کی حقیقت کو کبھی نہیں، کم از کم اپنی موت کی حقیقت کو کبھی نہیں۔۔ شائد موت سے انکار ہی زندگی کی علامت ہے۔۔ وبا کے ان دنوں میں مر جانا بہت غیر مناسب لگتا ہے۔"(۱۳)

ماہرِ نفسیات فرائڈ نے ذہن کو شعور، تحت الشعور اور لاشعور کے خانوں میں بانٹ دیا تھا۔ دیکھا جائے تو انسان کی زندگی میں شعور سے زیادہ لاشعور کا عمل کار فرما نظر آتا ہے۔ انسان کے وہ جذبات، احساسات اور کیفیات جو لاشعور کی گہرائیوں میں دبے ہوتے ہیں شعور کی سطح پر اُبھرنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ انسان کے اپنے افعال ہی کسی نہ کسی صورت میں لاشعور کو شعور کی سطح پر لانے کا محرک بنتے ہیں۔ وہ جذبات و احساسات جسے انسان سب سے چھپا کر رکھتا ہے یا وہ کیفیات جس کا اظہار وہ سب کے سامنے نہیں کر سکتا اس کو بیان کرنے کے لیے وہ دیگر ذرائع کو بروئے کار لاتا ہے۔ وہ باتیں جو لاشعور میں دبی ہوتی ہیں اور جس کا اظہار کرنے میں شاعر اور ادیب ہچکچاہٹ کا شکار رہتے ہیں اس کو بیان کرنے کے لیے وہ علامت کا سہارا لیتے ہیں۔ اپنے جذبات و احساسات کو دوسرے پیرائے میں جو مناسب بھی ہوں اور مماثل بھی بیان کرتے ہیں۔ اُردو نظم و نثر دونوں میں شروع سے علامتی انداز رائج ہے۔ علامت کے ذریعے ایک طرف جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے تو دوسری طرف انسان کے لاشعور میں چھپے ہوئے احساسات کو اظہار کا راستہ دکھاتی ہے۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین علامتوں کی تخلیق کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ:

> "فن کار علامتوں کی تخلیق شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر کرتا ہے۔ جب وہ جذباتی سیاق و سباق تعمیر کرتا ہے تو اس وقت لاشعور متحرک رہتا ہے اور اجتماعی لاشعور بھی شاملِ

حال رہتا ہے۔ اس طرح تخلیقی عمل اور اس کے اظہار میں بنیادی جبلت شعور، لاشعور اور اجتماعی لاشعور سب ہی مصروفِ عمل رہتے ہیں اور نت نئے انوکھے رنگ و روپ میں تخلیقی عمل کا حصہ بنتے رہتے ہیں۔"(۱۴)

اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک علامت ایک شاعر یا ادیب جب اپنی تخلیق میں استعمال کرتا ہے تو اس کے ایک معنی ہوتے ہیں اور وہی علامت کسی دوسرے شاعر یا ادیب کے ہاں دوسرے معنوں میں مستعمل ہوتی ہے جیسا کہ "رات"۔ رات کی علامت ظلمت، تاریکی، خوف، جہالت کے معنوں میں مستعمل ہے۔ لیکن اگر ہم ناصر کاظمی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے کلام میں "رات" تخلیق کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ اسی طرح زرد رنگ کو ہمیشہ اداسی اور افسردگی سے منسوب کیا جاتا ہے جب کہ ناصر کاظمی کے ہاں سرسوں کا پھول جو زرد رنگ کا ہوتا ہے ایک مکمل تہذیب کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے ناول "شہر خالی، کوچہ خالی" میں جو علامتیں استعمال ہوئی ہیں اس کا اگر جائزہ لیا جائے تو ناول میں استعمال ہونے والی علامتیں موضوع سے مطابقت رکھتی ہیں۔ ناول کا موضوع عالمی وبا کورونا ہے۔ ناول نگار نے زندگی اور موت کی کیفیات بیان کرنے کے لیے علامات کا سہارا لیا ہے۔ کریہہ صورت والا پرندہ "چیل" علامت ہے موت اور وبائی مرض کی۔ جب کہ خوب صورت پروں والا معصوم اور بے ضرر پرندہ "فاختہ" زندگی اور اُمید کی نوید لے کر مصنف کے منڈیر پر نمودار ہوتا ہے:

"وہ ایک فاختہ تھی۔ اُس کی گردن کے سیاہ پروں پر خوش نظر سفید دھبّے تھے۔ یہاں کی نہ تھی، دور کے دیسوں سے آئی تھی۔۔۔ وہ اُس منڈیر پر یوں براجمان تھی جیسے یہ اُس کا وہ گھونسلہ ہو جس میں وہ ازل سے رہتی تھی۔ وہ نسلِ انسانی کی بقا کی نوید لے کر آئی تھی۔۔ اُس کے تسلسل کی خوشخبری لے کر آئی تھی۔۔ وہ اُس کے منقطع ہونے کی تردید لے کر آئی تھی۔ تصدیق کرنے آئی تھی کہ وبا کہ یہ پانی سمٹ جائیں گے، تندور جن میں سے وہ ابلے تھے اُن میں واپس دفن ہو جائیں گے۔۔"(۱۵)

موت اگرچہ ایک اٹل حقیقت ہے اور ہر ذی نفس کو وقتِ مقررہ پر موت کا مزہ چکھنا ہے لیکن اس تسلیم شدہ حقیقت کے باوجود موت سے ہر کوئی خائف رہتا ہے۔ وبائی مریض کورونا کے دوران موت کے خوف نے انسان کو ذہنی و نفسیاتی طور پر متاثر کیا۔ وبا کے دوران جتنے جتن بھی کیے گئے وہ صرف اس صرف وبا سے بچنے کی لیے نہیں تھے بلکہ وبا کا شکار ہو کر مرنے کے خوف نے انسان کو حفاظتی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا۔ موت کا خوف انسان کے لاشعور میں رچ بس گیا ہے۔ شعوری سطح پر موت کی حقیقت کوئی بھی تسلیم نہیں کرنا چاہتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مصنف کے منڈیر پر جس روز خوش رنگ چڑیاں اترنے کی بجائے کوّے براجمان ہوتے ہیں تو مصنف اسے بدشگون قرار دیتا ہے۔

"آج میری کھڑکی کے باہر جو کھیل تماشے والی منڈیر ہے اُس پر سویرے دو تین کوّے آبراجمان ہوئے۔۔۔ویسے کوؤں کا منڈیر پر آبیٹھنا اچھا شگون نہیں ہے۔روایت ہے کہ جس گھر کی منڈیر کوّا بولے وہاں مہمان کی آمدن ہوتی ہے۔۔۔اور ان دنوں تو گھر سے کوئی نکلتا ہی نہیں تو مہمان موت کے سوااور کون ہو سکتا ہے۔"(۱۶)

مصنف کے خیال میں صرف کوّا ہی نحوست اور موت کی علامت نہیں ہے بلکہ کریہہ صورت چیل بھی اس کے لیے موت اور وبائی مرض کا استعارہ بن کر اس کے منڈیر پر براجمان ہوتی ہے:

"آج بھی بیدار ہونے پر میں نے سب سے پہلے کھڑکی کے پردے ہٹائے۔۔میرے دل میں کھد بد ہوئی کہ دیکھیں آج میری آنگن کے منڈیر پر کونسا پرندہ مہمان بن کر اترا ہے منڈیر سج جائے گی، آباد ہو جائے گی۔اور وہاں ایک بدرنگ کریہہ شکل والی چیل بیٹھی تھی ۔۔۔اس چیل کی آمد نے ہر سو ایک نحوست پھیلا دی تھی۔چیل کی وہاں موجودگی مجھے بے آرام کر رہی تھی۔۔ایک انجانا ساڈر میرے بدن کے مساموں سے پسینے کی مانند پھوٹنے لگا۔۔۔کہیں اس چیل نے بھی میری موت کی بو تو نہیں سونگھ لی۔۔چیلیں بھی تو مردار کھاتی ہیں۔۔۔میں نے کھڑکی کا پردہ پھر سے برابر کر دیا اور صوفے پر نڈھال ہو کر گر گیا۔اس باہر منڈیر پر بیٹھی چیل کی آمد میں جو مرگ سندیسہ تھا اُسے میں نے بہت محسوس کیا۔"(۱۷)

اپنی زمین، اپنی مٹی جہاں انسان کی جڑیں پیوست ہوتی ہیں اس مٹی سے پیار اور لگاؤ انسان کی سرشت میں شامل ہے۔مستنصر حسین تارڑ کی تخلیقات سے زمین اور مٹی سے والہانہ لگاؤ کا جذبہ ظاہر ہوتا ہے۔اُس نے جتنی علامتیں اور استعارے لیے ہیں اپنی سرزمین سے لیے ہیں۔اپنی تہذیب و ثقافت کو اجاگر کیا ہے۔اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"درجنوں درخت ہیں جو ہماری ثقافت کے مظہر ہیں، خاص طور پر پنجاب کی ثقافت میں ان کا بڑا حصہ ہے۔مثال کے طور پر پنجابی ثقافت میں ایک درخت کو "دریک" کہا جاتا ہے جس پر ترکونے اُگتے ہیں۔اسی طرح ایک درخت "شریں" ہے جس کے پیلے پھولوں پر جب سرِشام دھوپ پڑتی ہے تو منظر قابلِ دید ہوتا ہے۔۔۔یہ جتنی مثالیں اور استعارے ہیں وہ لکھتے وقت مجھے اپنی سرزمین سے لینے ہوتے ہیں۔میرا شہر لاہور ہے، دلی نہیں ،چنانچہ میں کبھی دلی کے پس منظر میں نہیں لکھوں گا۔"(۱۸)

مندرجہ بالا اقتباس میں مستنصر حسین تارڑ نے پنجابی ثقافت کا مظہر جس "شریں" نامی درخت کا ذکر کیا ہے اسی درخت کا ذکر ناول "شہر خالی، کوچہ خالی" میں بھی علامتی انداز میں ملتا ہے۔ کورونا وبا جس وقت پاکستان میں ظہور پذیر ہوئی تو وہ بہار کا موسم تھا۔ بہار کا موسم عموماً اُمید اور خوشی کا استعارہ بن کر اُبھرتا ہے۔ لیکن جس سال کورونا وبا نے مہلک وار جاری رکھتے ہوئے نظامِ زندگی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا اُس وقت جہاں ایک طرف فطرت اپنے جوبن پر تھی، رنگا رنگ خوبصورت پھولوں کی مہک فضا کو معطر اور پرندوں کی چہچہاہٹ ماحول کو رونق بخشنے کا سبب بن رہی تھی وہاں لوگ غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار ہو کر انجانے خوف اور دکھ میں مبتلا فطرت کی رنگینوں سے دور جبری تنہائی کا شکار گھروں میں محصور تھے۔ ناول میں درخت "شریں" اپنے دلفریب مہک کی بنا پر ایک طرف بہار کی خوبصورتی کا استعارہ بن کر ابھرتا ہے تو دوسری طرف پیلے رنگ کی مناسبت سے انسان کی طبیعت میں شامل افسردگی اور پژمردگی کی عکاسی کرتا ہے۔

> "البتہ ایک سویر جب میں اپنی بے حسی کی کیفیت میں مبتلا چلتا جاتا تھا تو مجھے ایک زرد نشیلی مہک کا احساس ہوا جیسے کسی چینی شہزادی کے بدن سے اٹھنے والی حدّت کا ایک زرد خمار ہو ۔۔شرینہہ کا ایک گھنیرا درخت تھا جو وبا کے ان موسموں میں زرد پھولوں سے اٹا ہوا تھا۔۔۔اگر آپ آج تک شرینہہ کے کسی پھول کی زرد نشیلی مہک سے آشنا نہیں ہوئے تو کتنے بدقسمت ہیں، آپ تو زرد خمار آور خوشبو کی سجادوگری سے بے خبر ہی رہے۔۔۔میاں محمد نے بچھڑ چکے عاشقوں کے چہروں کو سرِشام شرینہہ کے پھولوں پر جو زردی اُترتی ہے اس سے تشبیہ دی ہے۔"(۱۹)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و شعور دے کر اسے امورِ زندگی کی انجام دہی کے لیے سوچنے سمجھنے اور فکر و تدبر کی صلاحیت سے نوازا۔ انسان کی نسبت حیوان عقل و شعور سے عاری ہے۔ ان میں سوچنے اور سمجھنے کی حس نہیں ہے لیکن احساس و ادراک کی قوتیں تمام جانداروں میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کو اس کی استعداد کے مطابق اس قوت سے نوازا ہے۔ جیسا کہ چیونٹی کی حسِ شامہ تیز ہے جس کی بدولت وہ خوراک حاصل کرتی ہے۔ اسی طرح انسان خوشبو سونگھ کر یہ ادراک حاصل کرتا ہے کہ آیا یہ خوشبو گلاب کی ہے یا چنبیلی کی، حسی مدرکات کا یہ سرچشمہ حواسِ خمسہ کہلاتا ہے۔ حس سے مراد دریافت یا معلوم کرنا ہے۔ جبکہ حسی ادراک سے مراد وہ عمل جو دماغ میں کسی حِس کو سمجھنے کے لیے انجام پاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر ادب میں حِسی تصورات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "نفسیاتی لحاظ سے عام زندگی ہو یا ادب دونوں ہی میں حِسّی تصورات کا مطالعہ بے حد اہم ہے کہ انسان اپنے حواس کے ذریعے سے ہی خارجی وقوعات کا ادراک حاصل کرتا ہے۔"(۲۰)

نفسیات میں حس کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر انور جمال رقم طراز ہیں:

"علمِ نفسیات کی رو سے حس وہ سادہ تجربہ ہے جو سونگھنے، چکھنے، دیکھنے، سننے اور چھونے سے حاصل ہوتا ہے اور یہ تجربہ وقوفی نوعیت کا ہوتا ہے یعنی اس تجربے سے ہمیں کسی چیز کا علم حاصل ہوتا ہے۔ تمام جانور حتیٰ کہ حشرات الارض حواس کی نعمت سے فیض یاب ہیں۔"(۲۱)

جانوروں اور پرندوں کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ کسی بھی خطرے چاہے وہ قدرتی آفات زلزلہ، سیلاب وغیرہ کی صورت میں ہوں یا پھر وبائی مرض کی شکل میں ہوں اسے قبل از وقت پتہ چل جاتا ہے اور وہ اس خطرے سے بچنے کے لیے محفوظ ٹھکانوں کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔ گویا ان کی حسیات اسے اس خطرے سے آگاہ کرتی ہے۔ حسی ادراک کی صلاحیت ہر جاندار میں موجود ہے کسی بھی پریشانی، مصیبت یا خطرے سے قبل آگہی حسی ادارک کے بدولت ہی ہوتی ہے۔ خطرے سے قبل از وقت آگہی کو لوگ چھٹی حس بھی قرار دیتے ہیں۔ تخلیق کار کا وصف یہ ہے کہ وہ ان انسانی رویوں، جذبات اور محسوسات کو پہچاننے اور بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہے جسے عام لوگ محسوس کرنے اور بیان کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں۔ تخلیق کار صرف اپنے وارداتِ قلبی کا اظہار تخلیق کی صورت میں نہیں کرتے بلکہ اپنے عمیق مشاہدے کی بدولت معاشرے کی ان کہی باتوں، رویوں اور جذبوں کی شناخت کر کے اس کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ مایہ ناز ادیب مستنصر حسین تارڑ نے ناول "شہر خالی، کوچہ خالی" میں وبا کے شب و روز کی کہانی لکھ کر انسان کے لاشعور میں موجود اس ڈر اور خوف کو بیان کیا ہے جس کے زیرِ اثر ہر کوئی حسی ادراک کی بدولت اپنی موت کی بُو سنگھ چکا تھا:

"جانور کے اندر ایک قدیم حس ان زمانوں سے چلی آتی ہے جب وہ جنگل میں حیات کرتا تھا، وہ اپنی موت کی آمد کی بو سونگھ لیتا ہے۔۔۔ مجھے ان دنوں یہی محسوس ہو رہا ہے کہ انسانوں نے بھی موت کی بُو سونگھ لی ہے سب سے الگ ہو گئے ہیں، دیگر انسانوں سے دور ہو کر، اپنی ذاتی آماجگاہوں میں پوشیدہ ہو کر، تنہائی کی ایک موت کے منتظر ہو گئے ہیں۔ ان دنوں سب کے چہروں پر ڈر کی جو پرچھائیاں گزرتی جاتی ہیں اُس کا سبب بھی یہی ہے کہ وہ فنا کو اپنی جانب رینگتے محسوس کر رہے ہیں، انسانوں کے اندر بھی وہ حیوانی حس بیدار ہو گئی ہے جو کب کی مفقود ہو چکی تھی۔ انھیں بھی موت کی بُو آ رہی ہے۔"(۲۲)

نہ صرف انسانوں نے اپنی متوقع موت کی بو سونگھ لی تھی بلکہ حیوان بھی قوتِ شامہ کی بدولت موت کی بُو سونگھ چکے تھے۔ بلکہ انسان اور حیوان دونوں کے پلڑے برابر تھے۔ مصنف اس حوالے ناول میں رقم طراز ہیں:

"کیا وہ بلیّاں، بُھو کی بلیّاں۔۔۔ اس وبا سے جانبر ہو سکیں گی۔۔ ہو سکیں گی تب جب انسان کو اس سے نجات ملے گی ورنہ پرانے وقتوں میں انسان اور حیوان ایک ہی پلڑے میں تل

گئے ہیں۔ دونوں نے موت کی بُو سونگھ لی ہے۔ مجھ پر بھی کچھ اثر سا ہو جاتا ہے۔۔ گمان ہوتا ہے کہ میرے آس پاس بھی کوئی ایسی نامعلوم سی بُو ہے جس سے کبھی شناسائی نہیں رہی۔"(۲۳)

فینٹسی (PHANTANSY) یونانی لفظ PHANTASIA سے مستعار لیا گیا ہے جس کے معنی (a making visible) یعنی ظاہر کرنا یا واضح کرنا ہے۔ اُردو میں فینٹسی کا مطلب سرابِ خیال، قوتِ متخیلہ، واہمہ، مضحکہ خیز ہیں۔ فینٹسی میں تخیّل کی مدد سے فنکار ایسی خیالی دنیا کی تصویر پیش کرتا ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ فینٹسی کو کہانی کا وہ عنصر قرار دیا جاتا ہے جو خلافِ عقل، حقیقت سے دور، طلسماتی فضا کا حامل، غیر مرئی کرداروں پر مشتمل ہو۔ ابتدا ہی سے ادب کی دونوں اصناف نظم و نثر میں فینٹسی کا عمل دخل رہا ہے۔ ایک طرف داستان کی صورت میں دیومالائی قصے و کہانیوں میں لوگوں نے دلچسپی ظاہر کی، تو دوسری طرف مثنویوں میں جن، پری اور دیو کے کردار توجہ کا مرکز بنے رہے۔ داستان "طلسم ہوش ربا"، "فسانہ عجائب"، آرائش محفل، مثنوی "گلزارِ نسیم"، "سحر البیان" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ فینٹسی کا وجود اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ تحریری ادب کا۔ مصری کہانی "غرقابِ سفینہ" پہلی تحریری کہانی کے طور پر تسلیم کی گئی ہے جو آج سے چار ہزار برس پہلے قرطاسِ مصری (پیپرس) پر رقم کی گئی تھی۔ "غرقابِ سفینہ" فینٹسی پر مبنی کہانی ہے گویا پہلی تحریری کہانی ہی حقیقت کے برعکس، تخیّل پر مبنی، وہم اور عجیب و غریب تصورات پر مشتمل ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے لکھے گئے ناول "شہر خالی، کوچہ خالی" میں فینٹسی کا عنصر بھی شامل ہے۔ کیوں کہ ناول میں ہرن بات کرتا نظر آتی ہے۔ ناول میں شامل فینٹسی کے عنصر کو "حیوانی فینٹسی" کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ کیوں کہ "حیوانی فینٹسی" میں چرندوں و پرندوں سمیت دیگر بے جان اشیا کو انسانوں کی طرح بولتے اور بات کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ "آرائشِ محفل"، "فسانہ عجائب" اور "طوطی نامہ" حیوانی فینٹسی کی بہترین مثالیں ہیں۔ حیوانی فینٹسی کے متعلق سلطانہ بخش لکھتی ہیں:

"جانوروں پرندوں اور حیوانوں کو کردار دے کر کہانیاں لکھنے کا رواج تقریباً ہر خطے اور تہذیب میں دکھائی دیتا ہے۔ انسانی فکر کے اس مخصوص انداز میں اس طرزِ اظہار نے جنم لیا۔ ان کہانیوں میں تہذیبی اقدار اور رسم و رواج کے جو پہلو پیش کیے جاتے ہیں اور ملکی و تمدنی سیاست کے جو اصول مرتب کرنے کی سعی کی جاتی ہے اس کا گہرا تعلق اس مخصوص عہد کی تہذیب اور مخصوص ملک کی معاشرتی زندگی سے ہوتا ہے۔"(۲۴)

فینٹسی یا فنطاسیہ کے دیگر عناصر میں "رزمیہ یا حماسہ فینٹسی"، "تاریخی فینٹسی"، "رومانوی فینٹسی"، "سائنسی فینٹسی"، "سیاروی فینٹسی"، "اساطیری فینٹسی" اور "جادوئی فینٹسی" وغیرہ شامل ہیں۔ ناول "شہر خالی، کوچہ خالی" میں

مصنف نے انتہائی مہارت سے اپنے وقت کی گھمبیر حالات اور غیر یقینی صورت حال کی عکاسی فینٹسی کے سہارے کی ہے۔ ناول نگار نے اپنے اندر کا غبار ہرن سے مکالمے کی صورت میں نکال کر لاشعور میں دبے ہوئے جذبات کی تطہیر کی ہے۔ ہرن کا انسانوں کی طرح باتیں کرنا حقیقت کے برعکس ہے لیکن مصنف نے قوتِ متخیلہ کے بل بوتے پر ہرن کو انسان کی طرح روانی سے باتیں کرتے دکھایا ہے:

> "تم کون ہو بھئی؟ میں نے بالآخر پوچھا۔ دیکھتے نہیں کہ میں ایک ہرن ہوں۔۔ اُس کی آنکھوں میں شکایت کے ساتھ ناراضی بھی اتر آئی۔۔ ہرن تو ہو لیکن کہاں کے ہو؟ کیا لال سوہانڑا پارک سے فرار ہو کر آ گئے ہو۔۔۔ یا پھر خیر پور میرس کے مہرانوں جنگلوں کے باسی ہو اور بھٹک کر ادھر آ نکلے ہو۔۔ کہاں کے ہو؟، تم کہاں کے ہو؟ اُس نے بدتمیزی سے پُوچھا کہ وہ ایک باتیں کرنے والا ہرن تھا۔" (۲۵)

ڈاکٹر ممتاز احمد خان اپنی تصنیف "اُردو ناول کے چند اہم زاویے" میں فینٹسی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "فنتاسی ۔۔۔ ایک ایسے قصے کا نام ہے جہاں عقل و منطق کے بجائے ایک ایسی صورت احوال پر یقین کیا جائے جس کا وقوع پذیر ناممکن ہو لیکن اس کی تخلیق ہو اور وہ بھی اس طرح کہ عقب میں ہمارے زمانے میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا تصور بیدار رہے۔ اس میں ایک اخلاقی نظام کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس کے طنز کے پیچھے زندگی کی معنویت کا احساس پنہاں ہوتا ہے جو مختلف معاشرتی وجوہات کے بنا پر ہمارے عہد میں ختم ہوتی نظر آتی ہے مگر فنتاسی اس کا اثبات کراتی ہے۔" (۲۶)

ڈاکٹر ممتاز احمد کے مندرجہ بالا تعریف کو مدِ نظر رکھ کر کورونا وبا کے تناظر میں لکھے گئے ناول "شہر خالی، کوچہ خالی" میں شامل فینٹسی کے عنصر کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ بات صادق آتی ہے کہ مستنصر حسین تارڑ نے ہرن سے مکالمے کی صورت میں اپنے وقت میں ظہور پذیر ہونے والے حالات و واقعات کی نہ صرف عکاسی کی ہے بلکہ انسانی جبر جو فطرت کا چہرہ مسخ کرنے کی صورت میں سامنے آتا ہے کو بھی زیرِ بحث لانے کی کوشش کی ہے۔ انسانوں نے خود کو آباد کرنے کی خاطر ویرانوں کا رُخ کیا۔ وہ ویرانے جہاں حیوانوں کے مسکن تھے۔ انسان ویرانوں میں عمارتیں تعمیر کر کے وہاں پر پہلے سے آباد جانوروں کو ان کی آماجگاہوں سے بے دخل کر کے خود آباد ہوئے۔ کورونا وبا کے وقوع پذیر ہونے کے بعد جب انسان وبا کے ڈر سے گھروں میں محصور ہو گئے تو آبادیاں ایک بار پھر ویرانے کا منظر پیش کرنے لگی۔ لوگ وبا کے خوف سے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے اور فطرت آزاد تھی۔ وہی فطرت جس کا چہرہ مسخ کرنے میں انسانوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ انسان ایک جرثومے کے سامنے بے بسی کی تصویر بنے حالات کے پہلے جیسے ہونے کے منتظر تھے۔

"آج تمھارے شہر ویرانے ہوگئے ہیں، بستیاں سنسان ہو گئی ہیں اور تم لوگ خوف زدہ چوہوں کی مانند اپنے اپنے گھروں کے پنجروں میں بند ہو چکے ہو۔۔ اپنے اوپر نازل ہونے والی وبا کے جواز کبھی سائنس کی کتابوں میں تلاش کرتے ہو اور کبھی مقدس صحیفوں کا سہارا لیتے ہو اور جانتے ہی نہیں کہ تم نے جو ظلم کمایا ہے یہ اُس کا نتیجہ ہے۔۔ اس وبا نے ہماری بد دعاؤں سے جنم لیا ہے۔۔ تم وہاں ہوا کرتے تھے اپنی بستیوں کی فصیلوں کے اندر اور ہم اُن کے باہر تھے اپنے جنگلوں کی عافیت میں ۔۔ تمہارے اور ہمارے درمیان ویرانوں اور بے آباد وسعتوں کے سلسلے تھے جو تمہیں اور ہمیں بھی محفوظ رکھتے تھے ۔۔ پھر تم نے سؤروں کی مانند بچے جننے شروع کر دیے، اتنے بچے جنے کہ بستیوں میں گنجائش نہ رہی اور تم ہمارے جنگلوں اور صحراؤں پر قابض ہو گئے ۔۔ ہمیں اپنی سرزمینوں سے بے دخل کر دیا۔ یوں جب انسانوں اور حیوانوں کے درمیان محفوظ فاصلے نہ رہے، دونوں قریب آ گئے تو ایسی بیماریاں جو صرف حیوانوں میں پائی جاتی تھیں، انسانوں میں منتقل ہونے لگیں، یہ وبا تو ابتدا ہے۔۔ تم نے قدرت کے نظام کی خلاف ورزی کی ہے اس لیے تمہاری بساط سمیٹی جا رہی ہے۔ تمہیں اپنے کیے کی سزا مل رہی ہے۔"(۲۷)

مختصراً یہ کہ ناول "شہر خالی، کوچہ خالی" کورونا وبا کے موضوع پر لکھا گیا۔ اولین ناول ہے جس میں مصنف نے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ اس لیے ناول میں تخیّل کی کار فرمائی کم اور حقیقی واقعات زیادہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ناصر کاظمی، برگِ نے، لاہور: فضلِ حق اینڈ سنز دربار مارکیٹ، ۱۹۹۲ء، ص:۵۹

۲۔ مستنصر حسین تارڑ، شہر خالی، کوچہ خالی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء، ص:۱۲۳

۳۔ اجرا، سہ ماہی ادبی رسالہ، کراچی: اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۳ء، ص:۲۷

۴۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اُردو ناول، کراچی: انجمن اردو ترقی پاکستان، ۱۹۹۷ء، ص:۱۷۸

۵۔ مستنصر حسین تارڑ، شہر خالی، کوچہ خالی، ص:۲۷

۶۔ ایضاً، ص:۲۵

۷۔ ایضاً، ص:۲۲

۸۔ ایضاً، ص:۲۷۔۲۸

۹۔ ایضاً، ص:۵۵۔۵۶

۱۰۔ خرم سہیل، مستنصر حسین تارڑ سے مکالمہ، ڈان نیوز، ۱۷ جنوری ۲۰۱۹ء

۱۱۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، سگمنڈ فرائڈ، نظریہ تحلیلِ نفسی، لاہور: نگارشات پبلشرز، ۲۰۲۱ء، ص:۸۰

۱۲۔ مستنصر حسین تارڑ، شہر خالی، کوچہ خالی، ص:۹۰

۱۳۔ ایضاً، ص:۸۷

۱۴۔ روبینہ شاہین، ڈاکٹر، نفسیات اور ادبی تخلیق، عکاس انٹرنیشنل، کتاب ۲۸، اپریل ۲۰۱۸ء، ص:۱۱

۱۵۔ مستنصر حسین تارڑ، شہر خالی، کوچہ خالی، ص:۶۵

۱۶۔ ایضاً، ص:۸۴

۱۷۔ ایضاً، ص:۱۷۶

۱۸۔ خرم سہیل، مستنصر حسین تارڑ سے مکالمہ، ڈان نیوز، ۱۷ جنوری ۲۰۱۹ء

۱۹۔ مستنصر حسین تارڑ، شہر خالی، کوچہ خالی، ص:۱۱۹

۲۰۔ سلیم اختر ڈاکٹر، نفسیاتی تنقید، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص:۲۲۸

۲۱۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، جنوری ۲۰۱۶ء، ص:۹۵

۲۲۔ مستنصر حسین تارڑ، شہر خالی، کوچہ خالی، ص:۱۷۱

۲۳۔ ایضاً، ص:۱۷۱

۲۴۔ سلطانہ بخش، داستانیں اور مزاح، اسلام آباد: نیشنل بُک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۲ء، ص:۴۰

۲۵۔ مستنصر حسین تارڑ، شہر خالی، کوچہ خالی، ص:۶۸

۲۶۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اُردو ناول کے چند اہم زاویے، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۳ء، ص:۶۳

۲۷۔ مستنصر حسین تارڑ، شہر خالی، کوچہ خالی، ص:۴۷